مقالات

اسلام کا نظریۂ سیاسی

اسلام کے متعلق یہ فقرہ آپ اکثر سنتے رہتے ہیں کہ "یہ ایک جمہوری نظام ہے"۔ پچھلی صدی کے آخری دور سے اس فقرے کا بار بار اعادہ کیا جا رہا ہے۔ مگر جو لوگ اس کو زبان سے نکالتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ ان میں سے شائد ایک فی ہزار بھی ایسے نہیں ہیں جنہوں نے اس دین کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہو، اور یہ سمجھنے کی کوشش کی ہو کہ اسلام میں جمہوریت کس حیثیت سے ہے اور کس نوعیت کی ہے۔ ان میں سے بعض لوگ تو اسلامی نظام جماعت کی چند ظاہری شکلوں کو دیکھ کر جمہوریت کا نام اس پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ اور اکثر ایسے ہیں جنکی ذہنیت ہی کچھ اس طور پر بنی ہے کہ دنیا میں (اور خصوصاً ان کے حکمرانوں میں) جو چیز مقبولِ عام ہو، اس کو کسی نہ کسی طرح اسلام میں موجود ثابت کر دینا ان کے نزدیک اس مذہب کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ شاید وہ اسلام کو اُس یتیم بچے کی طرح سمجھتے ہیں جو ہلاکت سے بس اِسی طرح بچ سکتا ہے کہ کسی با اثر شخص کی سرپرستی اُس کو حاصل ہو جائے۔ یا پھر غالباً ان کا خیال یہ ہے کہ ہماری عزت محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے قائم نہیں ہو سکتی، بلکہ صرف اس طرح قائم ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے مسلک میں دنیا کے کسی چلتے ہوئے مسلک کے اصولوں کی جھلک دکھا دیں۔ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ جب دنیا میں اشتراکیت کا غلغلہ بلند ہوا تو مسلمانوں میں کچھ لوگوں نے پکارنا شروع کیا کہ اشتراکیت تو محض اسلام ہی کا ایک جدید ایڈیشن ہے۔ اور جب ڈکٹیٹرشپ کا آوازہ اٹھا تو کچھ دوسرے لوگوں نے اطاعت امیر، اطاعت امیر کی صدائیں بلند کرنی شروع کر دیں، اور لگے کہنے کہ دیکھو، یہاں سارا نظام جماعت ڈکٹیٹرشپ ہی پر قائم ہے۔

غرض اسلام کا نظریۂ سیاسی اس زمانہ میں ایک چیستاں، ایک چوں چوں کا مربہ بنکر رہ گیا ہے جس میں سے ہر وہ چیز نکال کر دکھادی جاتی ہے جس کا بازار میں چلن ہو۔ ضرورت ہے کہ باقاعدہ علمی طریقہ سے اس امر کی تحقیق کی جائے کہ فی الواقع اسلام کا سیاسی نظریہ کیا ہے۔ اس طرح نہ صرف اُن پراگندہ خیالیوں کا خاتمہ ہو جائیگا جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، اور نہ صرف اُن لوگوں کا منہ بند ہو جائیگا جنہوں نے حال میں علی الاعلان یہ لکھ کر اپنی جہالت کا ثبوت دیا تھا کہ "اسلام سرے سے کوئی سیاسی و تمدنی نظام تجویز ہی نہیں کرتا"، بلکہ درحقیقت تاریکیوں میں بھٹکنے والی دنیا کے سامنے ایک ایسی روشنی نمودار ہو جائیگی جسکی وہ سخت حاجتمند ہے، اگرچہ اپنی اس حاجت مندی کا شعور نہیں رکھتی۔

تمام اسلامی نظریات کی اساس سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ اسلام محض چند منتشر خیالات اور منتشر طریقہائے عمل کا مجموعہ نہیں ہے جس میں اِدھر اُدھر سے مختلف قسم کی چیزیں لاکر جمع کر دی گئی ہوں، بلکہ یہ ایک باضابطہ نظام ہے جسکی بنیاد چند مضبوط اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اُس کے بڑے بڑے ارکان سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک ہر چیز اُس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں کے متعلق اُس نے جتنے قاعدے اور ضابطے مقرر کیے ہیں ان سب کی روح اور ان کا جوہر اسکے اصولِ اوّلیّہ ہی سے ماخوذ ہے۔ اِن اصولِ اوّلیّہ سے پوری اسلامی زندگی اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ بالکل اسی طرح نکلتی ہے جس طرح درخت میں آپ دیکھتے ہیں کہ بیج سے جڑیں، اور جڑوں سے تنہ، اور تنے سے شاخیں، اور شاخوں سے پتیاں پھوٹتی ہیں، اور خوب پھیل جانے کے باوجود اسکی ایک ایک پتی اپنی جڑ کے ساتھ مربوط رہتی ہے۔ پس آپ اسلامی زندگی کے جس شعبے کو بھی سمجھنا چاہیں آپ کے لیے ناگزیر ہے کہ اسکی جڑ کی طرف رجوع کریں، کیونکہ اس کے بغیر آپ اسکی روح کو نہیں پا سکتے۔

انبیاء علیہم السلام کا مشن اسلام کے متعلق یہ بات تو آپ مجملاً جانتے ہی ہیں کہ یہ انبیاء علیہم السلام کا

مشن ہے۔ یہ صرف محمد ابن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا مشن نہیں ہے، بلکہ انسانی تاریخ کے قدیم ترین دور سے جتنے انبیاء بھی خدا کی طرف سے آئے ہیں، اُن سب کا یہی مشن تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی اجمالی طور پر آپ کو معلوم ہے کہ یہ سب نبی ایک خدا کی خدائی منوانے اور اسی کی عبادت کرانے آئے تھے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کا پردہ اٹھا کر ذرا آپ گہرائی میں اتریں۔ سب کچھ اسی پردے کے نیچے چھپا ہوا ہے۔ تجسس کی نگاہ ڈال کر اچھی طرح دیکھیے کہ ایک خدا کی خدائی منوانے سے مقصد کیا تھا، اور صرف اسی کی عبادت کرانیکا مطلب کیا تھا؟ اور آخر اس میں ایسی کونسی بات تھی کہ جہاں کسی اللہ کے بندے نے ما لکم من الٰہٍ غیرہ کا اعلان کیا اور ساری طاغوتی طاقتیں جھاڑ کا کانٹا بنکر اسکو چمٹ گئیں؟ اگر بات صرف اتنی ہی تھی جتنی آجکل سمجھی جاتی ہے کہ مسجد میں خدائے واحد کے آگے سجدہ کرلو اور پھر باہر نکل کر حکومتِ وقت (جو بھی وقت کی حکومت ہو) کی وفاداری و اطاعت میں لگ جاؤ، تو کس کا سر پھرا تھا کہ اتنی سی بات کیلئے خواہ مخواہ اپنی وفادار رعایا کی مذہبی آزادی میں مداخلت کرتا؟ آئیے، ہم تحقیق کرکے دیکھیں کہ خدا کی بارے میں انبیاء علیہم السلام کا اور دنیا کی دوسری طاقتوں کا اصل جھگڑا کس بات پر تھا۔

قرآن میں ایک جگہ نہیں بکثرت مقامات پر یہ بات صاف کردی گئی ہے کہ کفار و مشرکین، جن سے انبیاء کی لڑائی تھی، اللہ کے منکر نہ تھے۔ ان سب کو تسلیم تھا کہ اللہ ہے، اور وہی زمین و آسمان کا خالق، اور خود ان کفار و مشرکین کا خالق بھی ہے۔ کائنات کا سارا انتظام اسی کے اشارے سے ہو رہا ہے۔ وہی پانی برساتا ہے، وہی ہواؤں کو گردش دیتا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں سورج اور چاند اور زمین سب کچھ ہیں:

قُلْ لِمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيهَا اِنْ كُنْتُمْ	ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے وہ کس کا ہے، بتاؤ
تَعْلَمُوْنَ؟ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ۔ قُلْ اَفَلَا	اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہینگے کہ اللہ کا ہے۔ کہو، پھر تم غور
تَذَكَّرُوْنَ؟ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ	نہیں کرتے؟ ان سے پوچھو سات آسمانوں کا رب اور عرش
السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ؟ سَيَقُوْلُوْنَ	عظیم کا رب کون ہے؟ کہینگے اللہ۔ کہو پھر تم اس سے ڈرتے
لِلّٰهِ۔ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ؟ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ	نہیں؟ ان سے پوچھو وہ کون ہے جسکے ہاتھ میں ہر چیز کا
مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ	اختیار ہے اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے مگر کوئی اسکے مقابلہ

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ؟ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ۔ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ؟ (المومنون - ۵)	میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہینگے اللہ۔ کہو پھر تم کس دھوکے میں ڈال دیے گئے ہو؟
وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ؟ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ؟ ۔ ۔ ۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا؟ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (العنکبوت - ۶)	اگر تم اُن سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ اور کس نے سورج اور چاند کو اپنا تابع فرمان بنا رکھا ہے؟ وہ ضرور کہینگے کہ خدا نے۔ پھر آخر یہ کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں؟ ۔ ۔ ۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی اتارا اور کس نے مری ہوئی زمین کو روئیدگی بخش دی؟ وہ ضرور کہینگے کہ اللہ نے۔
وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ؟ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ؟ (الزخرف - ۷)	اور اگر تم ان سے پوچھو کہ تم کو کس نے پیدا کیا ہے؟ وہ ضرور کہینگے کہ اللہ نے۔ پھر آخر یہ کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں۔

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے ہونے میں، اور اسکے خالق ہونے اور مالک ارض وسما ہونے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ لوگ ان باتوں کو خود ہی مانتے تھے، لہٰذا ظاہر ہے کہ انہی باتوں کو منوانے کے لیے تو انبیاء کے آنے کی ضرورت تھی ہی نہیں۔ اب پوچھیے کہ انبیاء کی آمد کس لیے تھی، اور جھگڑا کس چیز کا تھا؟ قرآن کہتا ہے کہ سارا جھگڑا اس بات پر تھا کہ انبیاء کہتے تھے جو تمہارا اور زمین و آسمان کا خالق ہے وہی تمہارا رب اور الٰہ بھی ہے۔ اس کے سوا کسی کو الٰہ اور رب نہ مانو۔ مگر دنیا اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ آئیے، ذرا پھر تجسس کریں کہ اس جھگڑے کی تہ میں کیا ہے؟ الٰہ سے کیا مراد ہے؟ رب کسے کہتے ہیں؟ انبیاء کو کیوں اصرار تھا کہ صرف اللہ ہی کو الٰہ اور رب مانو؟ اور دنیا کیوں اس پر لڑنے کھڑی ہو جاتی تھی؟

الٰہ کے معنی آپ سب جانتے ہیں کہ معبود کے ہیں۔ مگر معاف کیجیے گا، معبود کے معنی آپ بھول گئے ہیں۔ معبود کا مادہ عبد ہے۔ عبد بندے اور غلام کو کہتے ہیں۔ عبادت کے معنی محض پوجا کے

نہیں ہیں، بلکہ بندہ اور غلام جو زندگی غلامی اور بندگی کی حالت میں بسر کرتا ہے، وہ پوری کی پوری سراسر عبادت ہے۔ خدمت کے لیے کھڑا ہونا، احترام میں ہاتھ باندھنا، اعترافِ بندگی میں سر جھکانا، فرماں برداری میں دوڑ دھوپ اور سعی وجہد کرنا، جس کام کا اشارہ ہو اسے بجالانا، جو کچھ آقا طلب کرے اُسے پیش کر دینا، اس کی طاقت وجبروت کے آگے ذلت اور عاجزی اختیار کرنا، جو قانون وہ بنائے اسکی اطاعت کرنا، جس کے خلاف وہ حکم دے اس پر چڑھ دوڑنا، جہاں اسکا فرمان ہو سر تک کٹوا دینا، یہ عبادت کا اصلی مفہوم ہے، اور آدمی کا معبود حقیقت میں وہی ہے جسکی عبادت وہ اس طرح سے کرتا ہے۔

اور رب کا مفہوم کیا ہے؟ عربی میں ربّ کے اصلی معنی پرورش کرنے والے کے ہیں۔ اور چونکہ دنیا میں پرورش کرنے والے ہی کی اطاعت وفرمانبرداری کی جاتی ہے، لہٰذا رب کے معنی مالک اور آقا کے بھی ہوئے۔ چنانچہ عربی محاورہ میں مال کے مالک کو رب المال، اور صاحب خانہ کو رب الدار کہتے ہیں۔ آدمی جسکو اپنا رازق اور اپنا مربی سمجھے، جس سے نوازش اور سرفرازی کی امید رکھے، جس سے عزت اور ترقی اور امن کا متوقع ہو، جسکی نگاہِ لطف کے پھر جانے سے خوف کرے کہ میری زندگی بگڑ جائیگی، جسکو اپنا آقا اور مالک قرار دے اور جسکی فرمانبرداری واطاعت کرے، وہی اسکا ربّ ہے۔

ان دونوں لفظوں کے معنی پر نگاہ رکھیے اور پھر غور سے دیکھیے۔ انسان کے مقابلہ میں یہ دعویٰ لے کر کون کھڑا ہو سکتا ہے کہ میں تیرا الٰہ ہوں، اور میں تیرا رب ہوں، میری بندگی وعبادت کر؟ کیا درخت؟ پتھر؟ دریا؟ جانور؟ سورج؟ چاند؟ تارے؟ کسی میں بھی یہ یارا ہے کہ وہ انسان کے سامنے آکر یہ دعویٰ پیش کر سکے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ صرف انسان ہی ہے جو انسان کے مقابلہ میں خدائی کا دعویٰ لیکر اٹھتا ہے اور اٹھ سکتا ہے۔ خدائی کی ہوس انسان ہی کے سر میں سما سکتی۔ انسان ہی کی حد سے

بڑھی ہوئی خواہشِ اقتدار، یا خواہشِ انتفاع اُسے اس بات پر ابھارتی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کا خدا بنے۔ ان سے اپنی بندگی کرائے۔ ان کے سر اپنے آگے جھکوائے۔ ان پر اپنا حکم چلائے۔ انکو اپنی خواہشات کے حصول کا آلہ بنائے۔ یہ خدا بننے کی لذت ایسی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی لذیذ چیز انسان آج تک دریافت نہیں کر سکا ہے۔ جسکو کچھ طاقت، یا دولت، یا چالاکی وہوشیاری، یا کسی نوع کا زور حاصل ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ اپنے فطری اور جائز حدود سے آگے بڑھے، پھیل جائے اور آس پاس کے انسانوں پر، جو اس کے مقابلہ میں ضعیف یا مفلس یا بے وقوف، یا کسی حیثیت سے بھی کمزور ہوں، اپنی خدائی کا سکہ جمادے۔

اس قسم کی ہوسِ خداوندی رکھنے والے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں، اور دو مختلف راستے اختیار کرتے ہیں۔

ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن میں زیادہ جرأت ہوتی ہے، یا جن کے پاس خدائی کے ٹھاٹھ جمانے کے لیے کافی ذرائع ہوتے ہیں، اس لیے وہ براہِ راست اپنی خدائی کا دعویٰ پیش کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک وہ فرعون تھا جس نے اپنی بادشاہی اور اپنے لشکروں کے بل بوتے پر مصر کے باشندوں سے کہدیا کہ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (میں تمہارا سب سے اونچا رب ہوں) اور مَا عَلِمْتُ لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرِیْ (میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا اور بھی کوئی الٰہ ہے)۔ جب حضرت موسیٰ نے اسکے سامنے اپنی قوم کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا، اور اس سے کہا کہ تو خود بھی الٰہ العالمین کی بندگی اختیار کر، تو اس نے کہا کہ میں تم کو جیل بھیج دینے کی قدرت رکھتا ہوں لہٰذا تم مجھ کو الٰہ تسلیم کرو (لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰھًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّکَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ)۔ اسی طرح ایک وہ بادشاہ تھا جس سے حضرت ابراہیمؑ کی بحث ہوئی تھی۔ قرآن میں اس کا ذکر جن الفاظ کے ساتھ آیا ہے انہیں ذرا غور کے ساتھ پڑھیے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَؕ (بقرہ۔ ۳۵)	تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے ابرٰہیم سے حجت کی اس بات میں کہ ابرٰہیم کا رب کون ہے؟ (اور یہ حجت کیوں کی؟) اسلیے کہ اللہ نے اسکو حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابرٰہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جسکے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا کہ زندگی اور موت میرے ہاتھ میں ہے۔ ابرٰہیم نے کہا اچھا اللہ تو سورج کو مشرق کی طرف سے لاتا ہے

تو ذرا اسے مغرب کی طرف سے نکال لا۔ یہ سن کر وہ کافر ہکا بکا رہ گیا۔

غور کیجیے! وہ کافر ہکا بکا کیوں رہ گیا؟ اس لیے کہ وہ اللہ کا منکر نہ تھا۔ وہ اس بات کا قائل تھا کہ کائنات کا فرمانروا اللہ ہی ہے۔ سورج کو وہی نکالتا اور وہی غروب کرتا ہے۔ جھگڑا اس بات میں نہ تھا کہ کائنات کا مالک کون ہے بلکہ اس بات میں تھا کہ انسانوں کا اور خصوصاً ارض بابل کے باشندوں کا مالک کون ہے۔ وہ اللہ ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتا تھا بلکہ اس بات کا دعویٰ رکھتا تھا کہ اس ملک کے باشندوں کا رب میں ہوں۔ اور یہ دعویٰ اس بنا پر تھا کہ حکومت اس کے ہاتھ میں تھی، لوگوں کی جانوں پر وہ قابض و متصرف تھا، اپنے آپ میں یہ قدرت پاتا تھا کہ جسے چاہے پھانسی پر لٹکا دے اور جسکی چاہے جاں بخشی کردے، یہ سمجھتا تھا کہ میری زبان قانون ہے، اور میرا حکم ساری رعایا پر چلتا ہے۔ اس لیے حضرت ابرٰاہیم سے اس کا مطالبہ یہ تھا کہ مجھے رب تسلیم کرو۔ میری بندگی اور عبادت کرو۔ مگر جب حضرت ابرٰاہیم نے کہا کہ میں تو اسی کو رب مانونگا اور اسی کی بندگی و عبادت بھی کرونگا جو زمین و آسمان کا رب ہے، اور جسکی عبادت یہ سورج کر رہا ہے، تو وہ حیران رہ گیا، اور اس لیے حیران رہ گیا کہ ایسے شخص کو کیوں کر قابو میں لاؤں؟

یہ خدائی، جس کا دعویٰ فرعون اور نمرود نے کیا تھا، کچھ انہی دو آدمیوں تک محدود نہ تھی۔ دنیا

میں ہر جگہ فرمانرواؤں کا یہی دعویٰ تھا اور یہی دعویٰ ہے۔ ایران میں بادشاہ کے لیے خدا اور خداوند کے الفاظ مستعمل تھے اور انکے سامنے پورے مراسم عبودیت بجا لائے جاتے تھے۔ حالانکہ کوئی ایرانی ان کو خدائے خدایگاں (یعنی اللہ) نہیں سمجھتا تھا، اور نہ وہ خود اس کے مدعی تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں فرمانروا خاندان اپنا نسب دیوتاؤں سے ملاتے تھے ـــــ چنانچہ سورج بنسی اور چندر بنسی آجتک مشہور ہیں ـــــ راجہ کو اَن داتا یعنی رازق کہا جاتا تھا اور اس کے سامنے سجدے کیے جاتے تھے۔ حالانکہ پرمیشور ہونے کا دعویٰ نہ کسی راجہ کو تھا اور نہ پرجا ہی ایسا سمجھتی تھی۔ ایسا ہی حال دنیا کے دوسرے ممالک کا بھی تھا اور آج بھی ہے۔ بعض جگہ فرمانرواؤں کے لیے الٰہ اور رب کے ہم معنی الفاظ اب بھی صریحاً بولے جاتے ہیں، مگر جہاں یہ نہیں بولے جاتے وہاں اسپرٹ وہی ہے جو ان الفاظ کے مفہوم میں پوشیدہ ہے۔ اس نوع کے دعوائے خدائی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی صاف الفاظ میں الٰہ اور رب ہونے ہی کا دعویٰ کرے۔ نہیں، وہ سب لوگ جو انسانوں پر اُس اقتدار، اُس فرمانروائی و حکمرانی، اُس آقائی و خداوندی کو قائم کرتے ہیں، جسے فرعون اور نمرود نے قائم کیا تھا، دراصل وہ الٰہ اور رب کے معنی و مفہوم کا دعویٰ کرتے ہیں۔ چاہے الفاظ کا دعویٰ نہ کریں۔ اور وہ سب لوگ جو انکی اطاعت و بندگی کرتے ہیں وہ بہرحال انکے الٰہ اور رب ہونے کو تسلیم کرتے ہیں، چاہے زبان سے یہ الفاظ نہ کہیں۔

غرض ایک قسم تو انسانوں کی وہ ہے جو براہ راست اپنی الٰہیت اور ربوبیت کا دعویٰ کرتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جسکے پاس اتنی طاقت نہیں ہوتی، اتنے ذرائع نہیں ہوتے کہ خود ایسا دعویٰ لیکر اٹھیں اور اسے منوالیں۔ البتہ چالاکی اور فریب کاری کے ہتھیار ہوتے ہیں جن سے وہ عام انسانوں کے دل و دماغ پر جادو کر سکتے ہیں۔ سو ان ذرائع سے کام لیکر وہ کسی روح، کسی دیوتا، کسی بت، کسی قبر، کسی سیّارے، کسی درخت کو الٰہ بنا دیتے ہیں، اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ تمہیں نفع اور ضرر پہنچانے پر قادر ہیں، یہ تمہاری حاجت روائی کر سکتے ہیں، یہ تمہارے ولی اور محافظ

و مددگار ہیں۔ ان کو خوش نہ کروگے تو یہ تمہیں قحط اور بیماریوں اور مصیبتوں میں مبتلا کردینگے۔ انہیں خوش کرکے حاجتیں طلب کروگے تو یہ تمہاری مدد کو پہنچینگے۔ مگر انہیں خوش کرنے اور ان کو تمہارے حال پر متوجہ کرنے کے طریقے ہم کو معلوم ہیں۔ ان تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہی بن سکتے ہیں۔ ہماری بزرگی تسلیم کرو، ہمیں خوش کرو، اور ہمارے ہاتھ میں اپنی جان مال آبرو سب کچھ دیدو۔ بہت سے بیوقوف انسان اس جال میں پھنس جاتے ہیں، اور یوں جھوٹے خداؤں کی آڑ میں ان پروہتوں اور پجاریوں اور مجاوروں کی خداوندی قائم ہوتی ہے۔

اسی نوع میں کچھ دوسرے لوگ ہیں جو کہانت اور نجوم اور فال گیری اور تعویذ گنڈوں اور منتروں کے وسیلے اختیار کرتے ہیں۔ کچھ اور لوگ ہیں جو اللہ کی بندگی کا اقرار تو کرتے ہیں، مگر کہتے ہیں کہ تم براہ راست اللہ تک نہیں پہنچ سکتے، اسکی بارگاہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہیں، عبادت کے مراسم ہمارے ہی واسطے سے ادا ہونگے، اور تمہاری پیدائش سے لیکر موت تک ہر مذہبی رسم ہمارے ہاتھوں سے انجام پائیگی۔ کچھ دوسرے لوگ ہیں جو اللہ کی کتاب کے حامل بن جاتے ہیں، عام لوگوں کو اسکے علم سے محروم کردیتے ہیں، اور خود اپنے زعم میں خدا کی زبان بن کر حلال و حرام کے احکام دینے شروع کرتے ہیں۔ یوں ان کی زبان قانون بن جاتی ہے، اور وہ انسانوں کو خدا کے بجائے خود اپنے حکم کا تابع بنالیتے ہیں۔ یہی اصل ہے اس برہمنیت اور پاپائیت کی جو مختلف ناموں اور مختلف صورتوں سے قدیم ترین زمانہ سے آج تک دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے، اور جس کی بدولت بعض خاندانوں، نسلوں یا طبقوں نے عام انسانوں پر اپنی سیادت کا سکہ جما رکھا ہے۔

اس نظر سے جب آپ دیکھینگے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں فتنہ کی اصلی جڑ اور فساد کا اصلی سرچشمہ انسان پر انسان کی خدائی ہے، خواہ وہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ۔ اسی سے خرابی کی ابتدا ہوئی اور اسی سے آج بھی بس کے زہریلے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو خیر انسان کی فطرت

کے سارے راز ہی جانتا ہے۔ مگر اب تو ہزار ہا برس کے تجربہ سے خود ہم پر بھی یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو چکی ہے کہ انسان کسی نہ کسی کو الٰہ اور رب مانے بغیر رہ ہی نہیں سکتا، گویا کہ اس کی زندگی محال ہے اگر کوئی اسکا الٰہ اور ربّ نہ ہو۔ اگر اللہ کو نہ مانے گا، تب بھی اسے الٰہ اور رب سے چھٹکارا نہیں ہے، بلکہ اس صورت میں بہت سے آلہہ اور ارباب اسکی گردن پر مسلط ہو جائینگے۔

غور سے دیکھیے۔ کیا روس میں کمیونسٹ پارٹی کی سیاسی مجلس (Political Bureau) کے ارکان باشندگان روس کے ارباب و آلہہ نہیں ہیں اور کیا اسٹالین اُن کا رب الارباب نہیں؟ روس کا کونسا گاؤں اور کونسا زرعی فارم ایسا ہے جہاں اِس خدائے روسیاں کی تصویر موجود نہیں؟ ابھی پولینڈ کے جس حصہ پر روس نے قبضہ کیا ہے اس میں سوویٹ سسٹم کی بسم اللہ آپ کو معلوم ہے کس طرح ہوئی؟ اسٹالین کی تصویریں ہزاروں کی تعداد میں درآمد کی گئیں، گاؤں گاؤں میں پہنچائی گئیں تاکہ سب سے پہلے وہ اپنے الٰہ العظیم اور رب کبیر سے واقف ہو لیں، تب ان کو دین بالشویکی میں داخل کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ آخر ایک انسان کو یہ اہمیت کیوں؟ کیا وجہ ہے کہ ایک آدمی کو، خواہ وہ جماعت (Community) کی نمائندگی ہی کر رہا ہو، کروڑوں انسان کے دماغوں اور ان کی روحوں پر اس طرح مسلط کر دیا جائے کہ اسکی شخصیت کا جبروت اور اسکی کبریائی انکے رگ و ریشہ میں پیوست ہو جائے؟ اِسی طریقہ سے تو شخصی اقتدار دنیا میں قائم ہوتا ہے۔ یونہی تو انسان انسانوں کا خدا بنتا ہے۔ یہی تو وہ ڈھنگ ہیں جن سے فرعونیت و نمرودیت کی اور زاریت و قیصریت کی جڑیں ہر زمانہ میں مستحکم ہوئی ہیں۔

اسی طرح اٹلی کو دیکھیے۔ وہاں فاشسٹ گرانڈ کونسل الٰہوں کا مجمع ہے اور مسولینی ان کا سب سے بڑا الٰہ۔ جرمنی میں نازی پارٹی کے لیڈر آلہہ ہیں اور ہٹلر ان کا الٰہ کبیر۔ انگلستان بھی اپنی ڈیموکریسی کے باوجود بینک آف انگلینڈ کے ڈائرکٹروں اور چند اونچے طبقے کے امراء و مدبرین میں اپنے آلہہ

رکھتا ہے۔ امریکہ میں وال اسٹریٹ کے چند مٹھی بھر سرمایہ دار تمام ملک کے ارباب و آلہہ بنے ہوئے ہیں۔ غرض آپ جدھر نظر ڈالینگے کہیں ایک قوم دوسری قوم کی الٰہ ہے۔ کہیں ایک طبقہ دوسرے طبقوں کا الٰہ ہے۔ کہیں ایک پارٹی نے الٰہیت و ربوبیت کے مقام پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اور کہیں ایک ڈکیٹر مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِي کی منادی کر رہا ہے۔ انسان کسی ایک جگہ بھی الٰہ کے بغیر نہ رہا۔

پھر انسان پر انسان کی خدائی قائم ہونے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہی جو ایک کمینے کم ظرف آدمی کو پولیس کمشنر بنا دینے، یا ایک جاہل تنگ نظر آدمی کو وزیر اعظم بنا دینے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اول تو خدائی کا نشہ ہی کچھ ایسا ہے کہ آدمی اس شراب کو پی کر کبھی اپنے قابو میں رہ نہیں سکتا۔ اور بالفرض اگر وہ قابو میں رہ بھی جائے تو خدائی کے فرائض انجام دینے کے لیے جس علم کی ضرورت ہے، جس محیط اور تمام حقائق پر حاوی نگاہ کی ضرورت ہے، جس حکمت اور عدل اور بے خطا میزان کی ضرورت ہے، اور جس بے لوثی و بے غرضی اور بے نیازی کی حاجت ہے وہ انسان کہاں سے لائیگا؟ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں انسانوں پر انسانوں کی الٰہیت و ربوبیت قائم ہوئی وہاں انسانی زندگی میں صحیح توازن کبھی قائم ہی نہ ہو سکا۔ وہاں ظلم، طغیان، ناجائز انتفاع، بے اعتدالی اور ناہمواری نے کسی نہ کسی صورت سے راہ پا ہی لی۔ وہاں انسانی روح اپنی فطری آزادی سے محروم ہو کر ہی رہی۔ وہاں انسان کے دل و دماغ پر اور اُس کی پیدائشی قوتوں اور صلاحیتوں پر ایسی بندشیں عائد ہو کر رہیں جنہوں نے انسانی شخصیت کے نشو و ارتقاء کو روک دیا۔ کس قدر سچ فرمایا اُس صادق و مصدوق علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام نے:

قال الله عز وجل انی خلقت عبادی حنفاء فجاءتهم الشياطين فاجتالتهم من دينهم وحرمت عليهم ما احللت لهم
(حدیث قدسی)

اللہ عز وجل فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو صحیح فطرت پر پیدا کیا تھا پھر شیطانوں نے آکر ان کو گھیر لیا، انہیں فطرت کی راہ راست سے ہٹا لے گئے، اور جو کچھ میں نے ان کے لیے حلال کیا تھا، ان شیطانوں نے انکو اس سے محروم کر کے رکھ دیا۔

جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، یہ ہے وہ چیز جو انسان کے سارے مصائب، اسکی ساری تباہیوں، اسکی تمام محرومیوں کی اصلی جڑ ہے - یہ اسکی ترقی کی راہ میں اصلی رکاوٹ ہے - یہ وہ روگ ہے جو اسکے اخلاق اور اسکی روحانیت کو، اسکی علمی و فکری قوتوں کو، اسکے تمدن اور اسکی معاشرت کو، اسکی سیاست اور اسکی معیشت کو، اور قصہ مختصر اسکی انسانیت کو تپِ دق کی طرح کھا گیا ہے - قدیم ترین زمانہ سے کھا رہا ہے اور آج تک کھائے چلا جاتا ہے - اِس روگ کا علاج بجز اسکے کچھ ہے ہی نہیں کہ انسان سارے ارباب اور تمام الٰہوں کا انکار کر کے صرف اللہ کو اپنا الٰہ اور صرف رب العالمین کو اپنا رب قرار دے - اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اسکی نجات کے لیے نہیں ہے، کیونکہ ملحد اور دہریہ بن کر بھی تو وہ الٰہوں اور ارباب سے چھٹکارا نہیں پا سکتا -

یہی وہ بنیادی اصلاح تھی جو انسانی زندگی میں انبیاء علیہم السلام نے کی - وہ دراصل انسان پر انسان کی خدائی تھی جس کو مٹانے کے لیے یہ لوگ آئے - ان کا اصلی مشن یہ تھا کہ انسان کو اس ظلم سے، اِن چھوٹے خداؤں کی بندگی سے، اِس طغیان اور ناجائز انتفاع سے نجات دلائیں - ان کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ جو انسان، انسانیت کی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں اُنہیں دھکیل کر پھر اس حد میں واپس پہنچائیں، جو اس حد سے نیچے گرا دیے گئے ہیں، اُنہیں ابھار کر اس حد تک اٹھا لائیں اور سب کو ایک ایسے عادلانہ نظام زندگی کا پابند بنا دیں جس میں کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا عبد ہو نہ معبود، بلکہ سب ایک اللہ کے بندے بن جائیں - ابتدا سے جتنے نبی دنیا میں آئے ان سب کا ایک ہی پیغام تھا اور وہ یہ تھا کہ یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہٍ غیرہٗ "لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اسکے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے"۔ یہی حضرت نوحؑ نے کہا، یہی حضرت ہودؑ نے کہا، یہی حضرت صالحؑ نے کہا، یہی حضرت شعیبؑ نے کہا،[۱] اور اسی کا اعلان محمد عربی صلی اللہ

[۱] - ملاحظہ ہو سورۂ ھود رکوع ۴ - ۵ - ۶ - ۸ -

علیہ وسلم نے کیا کہ :

اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ	میں تمہیں خبردار کرنے آیا ہوں - کوئی الٰہ نہیں ہے بجز اُس
الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	ایک اللہ کے جو سب پر غالب ہے ، جو رب ہے آسمانوں اور زمین کا
وَمَا بَيْنَهُمَا (ص - ۵)	اور ہر اس چیز کا جو آسمان و زمین کے درمیان ہے -
اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	یقیناً تمہارا رب اللہ ہے جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں
وَالْاَرْضَ . . . . وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ	اور زمین کو . . . . اور سورج اور چاند اور تاروں کو ، سب
مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اعراف - ۷)	اسکے حکم کے تابع ہیں - خبردار ! خلق بھی اسی کی ہے اور حکومت بھی اسی کی -
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ	وہ ہے اللہ ، وہی تمہارا رب ہے ، اور اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں -
كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (انعام - ۱۳)	وہ ہر چیز کا خالق ہے - لہٰذا تم اسکی بندگی کرو - اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے -
وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ	انسانوں کو کوئی حکم نہیں دیا گیا بجز اس کے کہ اللہ کی بندگی
لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ (البینہ)	کریں ، سب کو چھوڑ کر صرف اسی کی اطاعت کریں -
تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ	آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان
اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا	یکساں ہے ، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں ، اور خدائی
وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ	میں کسی کو اس کا شریک نہ قرار دیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو
دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران - ۷)	خدا کے سوا اپنا رب نہ بنالے -

یہی وہ منادی تھی جس نے انسان کی روح اور اسکی عقل و فکر اور اسکی ذہنی و مادی قوتوں کو غلامی کی ان بندشوں سے رہا کرایا جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے ، اور وہ بوجھ ان پر سے اتارے جن کے نیچے وہ دبے ہوئے تھے - یہ انسان کے لیے حقیقی آزادی کا چارٹر تھا - محمد رسول اللہ کے اسی کارنامے کے متعلق قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ

یعنی یہ نبی ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور ان بندھنوں کو کاٹتا ہے جن میں وہ کسے ہوئے تھے۔

نظریۂ سیاسی کا نقطۂ آغاز: انبیاء علیہم السلام نے انسانی زندگی کے لیے جو نظام مرتب کیا اس کا مرکز و محور اس کی روح اور اس کا جوہر یہی عقیدہ ہے اور اسی پر اسلام کے نظریۂ سیاسی کی بنیاد بھی قائم ہے۔ اسلامی سیاست کا اولین اصول یہ ہے کہ حکم دینے اور قانون بنانے کے اختیارات تمام انسانوں سے فرداً فرداً اور مجتمعاً سلب کر لیے جائیں۔ کسی شخص کا یہ حق تسلیم نہ کیا جائے کہ وہ حکم دے اور دوسرے اس کی اطاعت کریں۔ وہ قانون بنائے اور دوسرے اس کی پابندی کریں۔ یہ اختیار صرف اللہ کو ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (یوسف۔ ۵)	حکم سوائے اللہ کے اور کسی کا نہیں۔ اس کا فرمان ہے کہ اسکے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے۔
يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ (آل عمران۔ ۱۶)	وہ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہہ دو کہ اختیارات تو سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔
وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ (النحل ۱۵)	اپنی زبانوں سے یونہی غلط سلط نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام۔
وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (مائدہ۔ ۷)	جو خدا کی نازل کی ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی در اصل ظالم ہیں۔

اس نظریہ کے مطابق حاکمیت (Sovereignty) صرف خدا کی ہے۔ قانون ساز (Law-giver) صرف خدا ہے۔ کوئی انسان، خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو، بذات خود حکم دینے اور منع کرنے کا حق دار نہیں۔ نبی خود بھی اللہ ہی کے حکم کا پیرو ہے۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (انعام ۵) "میں تو صرف اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے"۔ عام انسان

سائبیریا کی طرف پھینک کر دیا جائے۔ اسلام نے غیر مسلموں کے لیے جو فیاضانہ برتاؤ اپنے اسٹیٹ میں اختیار کیا ہے، اور اس بارے میں عدل و ظلم اور راستی و ناراستی کے درمیان جو باریک خط امتیاز کھینچا ہے اسے دیکھ کر ہر انصاف پسند آدمی بیک نظر معلوم کر سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو مصلح آتے ہیں وہ کس طرح کام کرتے ہیں، اور زمین میں جو مصنوعی اور جعلی مصلحین اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان کا طریق کار کیا ہے۔

نظریۂ خلافت اب میں آپ کے سامنے اسلامی اسٹیٹ کی ترکیب اور اسکے طرزِ تعمیر کی تھوڑی سی تشریح کرونگا۔ یہ بات میں آپ سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں اصلی حاکم خداوند تعالیٰ ہے۔ اس اصل الاصول کو پیش نظر رکھ کر جب آپ اس سوال پر غور کرینگے کہ زمین میں جو لوگ خدا کے قانون کو نافذ کرنے کے لیے اٹھیں انکی حیثیت کیا ہونی چاہیے، تو آپ کا ذہن خود بخود پکاریگا کہ وہ اصلی حاکم کے نائب قرار پانے چاہییں۔ ٹھیک ٹھیک یہی حیثیت اسلام نے بھی انکو دی ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور - ۷)	اللہ نے وعدہ کیا ہے اُن لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنائیگا، اُسی طرح جس طرح اُن سے پہلے اس نے دوسروں کو خلیفہ بنایا تھا۔

یہ آیت اسلام کے نظریۂ ریاست (Theory of state) پر نہایت صاف روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں دو بنیادی نکات بیان کیے گئے ہیں:

پہلا نکتہ یہ ہے کہ اسلام حاکمیت (Sovereignty) کے بجائے خلافت (Vicegerency) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ چونکہ اس کے نظریہ کے مطابق

ہوگی کہ وہ خدا کے قانون کو نافذ کرنے والی ہو۔

اسلامی اسٹیٹ کی نوعیت ایک شخص بیک نظر ان خصوصیات کو دیکھ کر سمجھ سکتا ہے کہ یہ جمہوریت (Democracy) نہیں ہے۔ اس لیے کہ جمہوریت تو نام ہی اُس طرز حکومت کا ہے جس میں ملک کے عام باشندوں کو حاکمیت حاصل ہو، انہی کی رائے سے قوانین بنیں اور انہی کی رائے سے قوانین میں تغیر و تبدل ہو، جس قانون کو وہ چاہیں وہ نافذ ہو اور جسے نہ چاہیں وہ کتاب آئین پر سے محو کر دیا جائے۔ یہ بات اسلام میں نہیں ہے، لہٰذا اس معنی میں اسے جمہوریت نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے لیے زیادہ صحیح نام "الٰہی حکومت" ہے، جسکو انگریزی میں Theocracy کہتے ہیں۔ مگر یورپ جس تھیاکریسی سے واقف ہے، اسلامی تھیاکریسی اُس سے بالکل مختلف ہے۔ یورپ اُس تھیاکریسی سے واقف ہے جس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ (Priest class) خدا کے نام سے خود اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرتا ہے[1]، اور عملاً اپنی خدائی عام باشندوں پر مسلط کر دیتا ہے۔ ایسی حکومت کو تو الٰہی حکومت کے بجائے شیطانی حکومت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ بخلاف اسکے اسلام جس تھیاکریسی کو پیش کرتا ہے وہ کسی مخصوص مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں نہیں ہوتی، بلکہ عام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اور یہ عام مسلمان اسے خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق چلاتے ہیں۔ اگر مجھے ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو میں اس طرز حکومت کو (Theo-democracy) یعنی "الٰہی جمہوری حکومت" کے نام سے موسوم کرونگا۔ کیونکہ اس میں خدا کی حاکمیت اور اسکے اقتدار اعلیٰ (Paramountcy

---

[1] عیسائی پاپاؤں اور پادریوں کے پاس مسیح کی چند اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی شریعت سرے سے تھی ہی نہیں۔ لہٰذا وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشات نفس کے مطابق قوانین بناتے تھے اور یہ کہکر انہیں نافذ کرتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔ فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ۔

کے تحت مسلمانوں کو ایک محدود عمومی حاکمیت (Limited Popular Sovereignty) عطا کی گئی ہے ۔ اس میں عاملہ یعنی (Executive) مسلمانوں کی رائے سے بنیگی ۔ مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہونگے ۔ سارے انتظامی معاملات ، اور تمام وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے ، مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہونگے ۔ اور الٰہی قانون جہاں تعبیر طلب ہوگا وہاں کوئی مخصوص نسل یا طبقہ نہیں ، بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص اس کی تعبیر کا مستحق ہوگا جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہنچائی ہو ۔ اس لحاظ سے یہ ڈیموکریسی ہے ۔ مگر جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں ، جہاں خدا اور اس کے رسول کا حکم موجود ہو وہاں مسلمانوں کے کسی امیر کو ، کسی یجسلیچر کو ، کسی مجتہد اور عالم دین کو ، بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو مل کر بھی اس حکم میں یک سر مو ترمیم کرنے کا حق حاصل نہیں ہے ۔ اس لحاظ سے یہ تھیا کریسی ہے ۔

ایک اعتراض آگے بڑھنے سے پہلے میں اس امر کی تھوڑی سی تشریح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام میں ڈیموکریسی پر یہ حدود و قیود کیوں عائد کیے گئے ہیں ۔ اور ان حدود و قیود کی نوعیت کیا ہے ۔ اعتراض کرنے والا یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ اس طرح تو خدا نے انسانی عقل و روح کی آزادی سلب کر لی ، حالانکہ ابھی تم یہ ثابت کر رہے تھے کہ ایک خدا کی الٰہیت انسان کو عقل و فکر اور جسم و جان کی آزادی عطا کرتی ہے ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قانون سازی کا اختیار اللہ نے اپنے ہاتھ میں انسان کی فطری آزادی سلب کرنے کے لیے نہیں بلکہ اسکو محفوظ کرنے کے لیے لیا ہے ۔ اس کا مقصد انسان کو بے راہ ہونے اور اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے سے بچانا ہے ۔

یہ مغرب کی نام نہاد ڈیموکریسی ، جس کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس میں عمومی حاکمیت (popular sovereignty) ہوتی ہے ، اس کا ذرا تجزیہ تو کر کے دیکھیے ۔ جن لوگوں سے مل کر کوئی اسٹیٹ بنتا ہے وہ سب کے سب نہ تو خود قانون بناتے ہیں اور نہ خود اسکو نافذ کرتے ہیں ، انہیں

اپنی حاکمیت چند منتخب لوگوں کے سپرد کرنی پڑتی ہے تاکہ انکی طرف سے وہ قانون بنائیں اور انہیں نافذ کریں۔ اسی غرض سے انتخاب کا ایک نظام مقرر کیا جاتا ہے۔ اس انتخاب میں زیادہ تر وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو عوام کو اپنی دولت، اپنے علم، اپنی چالاکی، اور اپنے جھوٹے پروپیگنڈا کے زور سے بیوقوف بنا سکتے ہیں۔ پھر یہ خود عوام کے ووٹ ہی سے ان کے الٰہ بن جاتے ہیں۔ عوام کے فائدے کے لیے نہیں بلکہ اپنے شخصی اور طبقاتی فائدے کے لیے قوانین بناتے ہیں، اور اُسی طاقت سے جو عوام نے ان کو دی ہے، ان قوانین کو عوام پر نافذ کرتے ہیں۔ یہی مصیبت امریکہ میں ہے۔ یہی انگلستان میں ہے اور یہی ان سب ممالک میں ہے جن کو آج جمہوریت کی جنّت ہونے کا دعویٰ ہے۔

پھر اس پہلو کو نظر انداز کر کے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہاں عام لوگوں ہی کی مرضی سے قانون بنتے ہیں، تب بھی تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عام لوگ خود بھی اپنے مفاد کو نہیں سمجھ سکتے۔ انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ یہ اپنی زندگی کے اکثر معاملات میں حقیقت کے بعض پہلوؤں کو دیکھتا ہے اور بعض کو نہیں دیکھتا۔ اس کا فیصلہ (judgment) عموماً ایک طرفہ ہوتا ہے۔ اس پر جذبات اور خواہشات کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ یہ خالص عقلی اور علمی حیثیت سے بے لاگ رائے بہت کم قائم کر سکتا ہے، بلکہ بسا اوقات عقلی و علمی حیثیت سے جو بات اِس پر روشن ہو جاتی ہے اُس کو بھی یہ جذبات و خواہشات کے مقابلہ میں رد کر دیتا ہے۔ اس کے ثبوت میں بہت سی مثالیں میرے سامنے ہیں مگر طوالت سے بچنے کے لیے میں صرف امریکہ کے قانون منع شراب (Prohibition law) کی مثال پیش کرونگا۔ علمی اور عقلی حیثیت سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ شراب صحت کے لیے مضر ہے، عقلی و ذہنی قوتوں پر برا اثر ڈالتی ہے، اور انسانی تمدن میں فساد پیدا کرتی ہے۔ انہی حقائق کو تسلیم کر کے امریکہ کی رائے عام اس بات کے لیے راضی ہوئی تھی کہ منع شراب کا قانون پاس کیا جائے۔ چنانچہ عوام کے ووٹ ہی سے یہ قانون پاس ہوا تھا۔ مگر جب

وہ نافذ کیا گیا تو انہی عوام نے جن کے ووٹ سے وہ پاس ہوا تھا اسکے خلاف بغاوت کی۔ بدتر سے بدتر قسم کی شرابیں ناجائز طور پر بنائیں اور پییں۔ پہلے سے کئی گنا زیادہ شراب کا استعمال ہوا۔ جرائم میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا۔ آخر کار انہی عوام کے ووٹوں سے وہ شراب جو حرام کی گئی تھی، حلال کردی گئی۔ یہ حرمت کا فتویٰ حلت سے جو بدلا گیا، اسکی وجہ یہ نہ تھی کہ علمی و عقلی حیثیت سے اب شراب کا استعمال مفید ثابت ہوگیا تھا۔ بلکہ صرف یہ وجہ تھی کہ عوام اپنی جاہلانہ خواہشات کے بندے بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی حاکمیت اپنے نفس کے شیطان کی طرف منتقل کردی تھی۔ اپنی خواہش کو اپنا الٰہ بنالیا تھا، اور اس الٰہ کی بندگی میں وہ اُس قانون کو بدلنے پر مصر تھے جسے انہوں نے خود ہی علمی اور عقلی حیثیت سے صحیح تسلیم کرکے پاس کیا تھا۔ اس قسم کے اور بہت سے تجربات ہیں جن سے یہ بات روشن ہوجاتی ہے کہ انسان خود اپنا واضع قانون (legislator) بننے کی پوری اہلیت نہیں رکھتا۔ اگر اُس کو دوسرے الٰہوں کی بندگی سے رہائی مل بھی جائے تو وہ اپنی جاہلانہ خواہشات کا بندہ بن جائیگا۔ اپنے نفس کے شیطان کو الٰہ بنالیگا۔ لہٰذا وہ اس کا محتاج ہے کہ اس کی آزادی پر خود اس کے اپنے مفاد میں مناسب حدیں لگادی جائیں۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہ قیود عائد کی ہیں جن کو اسلام کی اصطلاح میں "حدود اللہ" (Divine limits) کہا جاتا ہے۔ یہ حدود زندگی کے ہر شعبے میں چند اصول، چند ضوابط اور چند قطعی احکام پر مشتمل ہیں جو اس شعبے کے اعتدال و توازن کو برقرار رکھنے کے لیے لگائی گئی ہیں۔ ان کا منشا یہ ہے کہ یہ تمہاری آزادی کی آخری حدیں ہیں۔ ان کے اندر رہ کر تم اپنے برتاؤ کے لیے ضمنی اور فروعی قاعدے (Regulations) بنا سکتے ہو۔ مگر ان حدود سے تجاوز کرنے کی تمہیں اجازت نہیں ہے۔ ان سے تجاوز کروگے تو تمہاری اپنی زندگی کا نظام فاسد و مختل ہوجائیگا۔

حدود اللہ کا مقصد مثال کے طور پر انسان کی معاشی زندگی کو لیجیے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے شخصی ملکیت کا حق، زکوٰۃ کی فرضیت، سود کی حرمت، جوے اور سٹے کی ممانعت، وراثت کا قانون، اور دولت کمانے، جمع کرنے اور خرچ کرنے پر پابندیاں عائد کر کے چند سرحدی نشانات لگا دیے ہیں۔ اگر انسان ان نشانات کو برقرار رکھے اور انکے اندر رہ کر اپنے معاشی معاملات کی تنظیم کرے تو ایک طرف شخصی آزادی (Personal liberty) بھی محفوظ رہتی ہے اور دوسری طرف طبقاتی جنگ (class-war) اور ایک طبقہ پر دوسرے طبقہ کے تسلط کی وہ حالت بھی پیدا نہیں ہوسکتی جو ظالمانہ سرمایہ داری سے شروع ہو کر مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ پر منتہی ہوتی ہے۔

اسی طرح عائلی زندگی (family life) میں اللہ نے حجاب شرعی، مرد کی قوامیت، شوہر بیوی اور بچوں کے حقوق و فرائض، طلاق اور خلع کے احکام، تعدد ازواج کی مشروط اجازت، زنا اور قذف کی سزائیں مقرر کر کے ایسی حدیں کھڑی کر دی ہیں کہ اگر انسان انکی ٹھیک ٹھیک نگہداشت کرے اور انکے اندر رہ کر اپنی خانگی زندگی کو منضبط کرے تو نہ گھر ظلم و ستم کی دوزخ بن سکتے ہیں، اور نہ انہی گھروں سے عورتوں کی شیطانی آزادی کا وہ طوفان اٹھ سکتا ہے جو آج پوری انسانی تہذیب کو غارت کر دینے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔

اسی طرح انسانی تمدن و معاشرت کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے قصاص کا قانون، چوری کے لیے ہاتھ کاٹنے کی سزا، شراب کی حرمت، جسمانی ستر کے حدود اور ایسے ہی چند مستقل قاعدے مقرر کر کے فساد کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے ہیں۔

میرے لیے اتنا موقع نہیں ہے کہ میں حدود اللہ کی ایک مکمل فہرست آپ کے سامنے پیش کر کے تفصیل کے ساتھ بتاؤں کہ انسانی زندگی میں توازن و اعتدال قائم کرنے کے لیے ان میں سے ایک ایک حد کس قدر ضروری ہے۔ یہاں میں صرف یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے

اس طریقہ سے ایک ایسا مستقل، ناقابلِ تغیر و تبدل دستور (Constitution) بنا کر انسان کو دے دیا ہے جو اسکی روح کی آزادی کو سلب اور اسکی عقل و فکر کو معطل نہیں کرتا، بلکہ اسکے لیے ایک صاف، واضح اور سیدھا راستہ مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنی جہالت اور اپنی کمزوریوں کے سبب سے تباہی کی بھول بھلیوں میں بھٹک نہ جائے اور اسکی قوتیں غلط راستوں میں ضائع نہ ہوں، اور وہ اپنی حقیقی فلاح و ترقی کی راہ پر سیدھا بڑھتا چلا جائے۔ اگر آپ کو کسی پہاڑی مقام پر جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ پُر پیچ پہاڑی راستوں میں، جن کے ایک طرف عمیق غار اور دوسری طرف بلند چٹانیں ہوتی ہیں، سڑک کے کناروں کو ایسی رکاوٹوں سے محفوظ کر دیا جاتا ہے کہ مسافر غلطی سے کھڈ کی طرف نہ چلا جائے۔ کیا ان رکاوٹوں کا مقصد راہ رو کی آزادی کو سلب کرنا ہے؟ نہیں۔ دراصل ان سے مقصد یہ ہے کہ اس کو ہلاکت سے محفوظ رکھا جائے اور ہر پیچ، ہر موڑ اور ہر امکانی خطرہ کے موقع پر اسے بتایا جائے کہ تیرا راستہ اُدھر نہیں اِدھر ہے، تجھے اُس رخ پر نہیں اِس رخ پر مڑنا چاہیے تاکہ تو بسلامت اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکے۔ بس یہی مقصد اُن حدوں کا بھی ہے جو خدا نے اپنے دستور میں مقرر کی ہیں۔ یہ حدیں انسان کے لیے زندگی کے سفر کا صحیح رخ معین کرتی ہیں اور ہر پر پیچ مقام، ہر موڑ اور ہر دو راہے پر اسے بتاتی ہیں کہ سلامتی کا راستہ اِس طرف ہے، تجھے اُن سمتوں پر نہیں بلکہ اِس سمت پر پیش قدمی کرنی چاہیے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں خدا کا مقرر کیا ہوا یہ دستور ناقابلِ تغیر و تبدل ہے۔ آپ اگر چاہیں تو ترکی اور ایران کی طرح اس دستور کے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں۔ مگر اس کو بدل نہیں سکتے۔ یہ قیامت تک کے لیے اٹل دستور ہے۔ اسلامی اسٹیٹ جب بنے گا اسی دستور کے ساتھ بنے گا۔ جب تک قرآن اور سنت رسول دنیا میں باقی ہے، اس دستور کی ایک دفعہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹائی جا سکتی۔ جس کو مسلمان رہنا ہو وہ اس کی پابندی پر مجبور ہے۔

اسلامی اسٹیٹ کا مقصد اس دستور کی حدود کے اندر جو اسٹیٹ بنے، اسکے لیے ایک مقصد بھی خدا نے معین کر دیا ہے، اور اس کی تشریح قرآن میں متعدد مقامات پر کی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ	ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایتوں کے ساتھ بھیجا
وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ	اور اسکے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ انصاف
النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ	پر قایم ہوں اور ہم نے لوہا اتارا جس میں زبردست طاقت
بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (الحدید-۳)	ہے اور لوگوں کے لیے فائدے ہیں۔

اس آیت میں لوہے سے مراد سیاسی قوت ہے۔ اور رسولوں کا کام یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی واضح ہدایات اور اپنی کتاب آئین میں جو میزان اُن کو دی ہے، یعنی جس ٹھیک ٹھیک متوازن (well balanced) نظام زندگی کی طرف انکی رہنمائی فرمائی ہے، اس کے مطابق اجتماعی عدل (social justice) قائم کریں۔ دوسری جگہ فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا	یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں تمکن (حکومت)
الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ	عطا کرینگے تو یہ نماز قائم کرینگے، زکوٰۃ دینگے، نیکی کا حکم کرینگے
وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج-۶)	اور بدی سے روکینگے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	تم وہ بہترین جماعت ہو جسے نوع انسانی کے لیے نکالا گیا ہے
تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ	تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ
وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران-۱۲)	پر ایمان رکھتے ہو۔

ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن جس اسٹیٹ کا تخیل پیش کرتا

ہے اس کا مقصد محض سلبی (Negative) نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایجابی (Positive)
مقصد اپنے سامنے رکھتا ہے ۔ اس کا مدعا صرف یہی نہیں ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے
سے روکے ، انکی آزادی کی حفاظت کرے ، اور مملکت کو بیرونی حملوں سے بچائے ۔ بلکہ اس کا مدعا
اجتماعی عدل کے اُس متوازن نظام کو رائج کرنا ہے جو خدا کی کتاب پیش کرتی ہے ۔ اس کا مقصد بدی
کی اُن تمام شکلوں کو مٹانا ، اور نیکی کی اُن تمام صورتوں کو قائم کرنا ہے جن کو خدا نے اپنی واضح ہدایات
میں بیان کیا ہے ۔ اس کام میں حسب موقع و محل سیاسی طاقت بھی استعمال کی جائیگی ، تبلیغ و تلقین
سے بھی کام لیا جائیگا ، تعلیم و تربیت کے ذرائع بھی کام میں لائے جائینگے ، اور جماعتی اثر اور رائے
عام کے دباؤ کو بھی استعمال کیا جائیگا ۔

ہمہ گیر اسٹیٹ اس نوعیت کا اسٹیٹ ، ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتا ۔ یہ
ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے ۔ اس کا دائرۂ عمل پوری انسانی زندگی پر محیط ہے ۔ یہ تمدن کے ہر شعبے
کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے ۔ اس کے مقابلہ میں
کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی (Personal) نہیں کہہ سکتا ۔ اس لحاظ سے
یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے یک گونہ مماثلت رکھتا ہے ۔ مگر آگے چل کر آپ دیکھینگے
کہ اس کلیت کے باوجود اس میں موجودہ زمانہ کی کلی (Totalitarian) اور استبدادی
(Authoritarian) حکومتوں کا سا رنگ نہیں ہے ، اس میں شخصی آزادی سلب نہیں
کی جاتی اور نہ اس میں آمریت (Dictatorship) پائی جاتی ہے ۔ اس معاملہ میں جو کمال
درجہ کا اعتدال اسلامی نظام حکومت میں قائم کیا گیا ہے ، اور حق و باطل کے درمیان جیسی نازک
اور باریک سرحدیں قائم کی گئی ہیں ، انہیں دیکھ کر ایک صاحب بصیرت آدمی کا دل بے اختیار گواہی
دینے لگتا ہے کہ ایسا متوازن نظام حقیقت میں خدائے حکیم و خبیر ہی وضع کر سکتا ہے ۔

جماعتی اور مسلکی اسٹیٹ دوسری بات جو اسلامی اسٹیٹ کے دستور اور اس کے مقصد اور اسکی اصلاحی نوعیت پر غور کرنے سے خود بخود واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسے اسٹیٹ کو صرف وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو اس کے دستور پر ایمان رکھتے ہوں، جنہوں نے اس کے مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہو، اور جو اسکے اصلاحی پروگرام سے نہ صرف پوری طرح متفق ہوں، نہ صرف اس میں کامل عقیدہ رکھتے ہوں، بلکہ اسکی اسپرٹ کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہوں اور اسکی تفصیلات سے واقف بھی ہوں۔ اسلام نے اس باب میں کوئی نسلی، جغرافی، لونی یا لسانی قید نہیں رکھی ہے۔ وہ تمام انسانوں کے سامنے اپنے دستور، اپنے مقصد اور اپنے اصلاحی پروگرام کو پیش کرتا ہے۔ جو شخص بھی اسے قبول کرلے، خواہ وہ کسی نسل، کسی ملک اور کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو، وہ اُس جماعت میں شریک ہو سکتا ہے جو اس اسٹیٹ کو چلانے کے لیے بنائی گئی ہے۔ مگر جو اسے قبول نہ کرے اسے اسٹیٹ کے کام میں دخیل نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اسٹیٹ کے حدود میں ذمّی (Subject) کی حیثیت سے رہ سکتا ہے۔ اسکے لیے اسلام کے قانون میں معیّن حقوق اور مراعات موجود ہیں۔ اسکی جان و مال اور عزت کی پوری حفاظت کی جائیگی، اور اگر وہ کسی خدمت کا اہل ہوگا تو اس سے خدمت بھی لی جائیگی، لیکن بہر حال اس کو حکومت میں شریک کی حیثیت نہیں دی جائیگی، کیونکہ یہ ایک خاص مسلک رکھنے والی پارٹی کا اسٹیٹ ہے۔ یہاں بھی اسلامی اسٹیٹ اور کمیونسٹ اسٹیٹ میں یک گونہ مماثلت پائی جاتی ہے، لیکن دوسرے مسلکوں پر اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ جو برتاؤ اشتراکی جماعت کا اسٹیٹ کرتا ہے اس کو اس برتاؤ سے کوئی نسبت نہیں جو اسلامی جماعت کا اسٹیٹ کرتا ہے۔ اسلام میں وہ صورت نہیں ہے جو کمیونسٹ حکومت میں ہے کہ غلبہ و اقتدار حاصل کرتے ہی اپنے تمدنی اصولوں کو دوسروں پر بجبر مسلط کر دیا جائے، جائدادیں ضبط کی جائیں، قتل و خون کا بازار گرم ہو، اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر زمین کے جہنم،

سائبیریا کی طرف پیک کر دیا جائے۔ اسلام نے غیر مسلموں کے لیے جو فیاضانہ برتاؤ اپنے اسٹیٹ میں اختیار کیا ہے، اور اس بارے میں عدل و ظلم اور راستی و ناراستی کے درمیان جو باریک خط امتیاز کھینچا ہے اسے دیکھ کر ہر انصاف پسند آدمی بیک نظر معلوم کر سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو مصلح آتے ہیں وہ کس طرح کام کرتے ہیں، اور زمین میں جو مصنوعی اور جعلی مصلحین اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان کا طریق کار کیا ہے۔

نظریۂ خلافت اب میں آپ کے سامنے اسلامی اسٹیٹ کی ترکیب اور اسکے طرز تعمیر کی تھوڑی سی تشریح کرونگا۔ یہ بات میں آپ سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں اصلی حاکم خداوند تعالیٰ ہے۔ اس اصل الاصول کو پیش نظر رکھ کر جب آپ اس سوال پر غور کرینگے کہ زمین میں جو لوگ خدا کے قانون کو نافذ کرنے کے لیے اٹھیں انکی حیثیت کیا ہونی چاہیے، تو آپ کا ذھن خود بخود پکار یگا کہ وہ اصلی حاکم کے نائب قرار پانے چاہییں۔ ٹھیک ٹھیک یہی حیثیت اسلام نے بھی انکو دی ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور - ۷)	اللہ نے وعدہ کیا ہے اُن لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنائیگا، اُسی طرح جس طرح اُن سے پہلے اس نے دوسروں کو خلیفہ بنایا تھا۔

یہ آیت اسلام کے نظریہ ریاست (Theory of state) پر نہایت صاف روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں دو بنیادی نکات بیان کیے گئے ہیں:

پہلا نکتہ یہ ہے کہ اسلام حاکمیت (Sovereignty) کے بجائے خلافت (Vicegerency) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ چونکہ اس کے نظریہ کے مطابق

حاکمیت خدا کی ہے لہٰذا جو کوئی اسلامی دستور کے تحت زمین پر حکمراں ہو اسے لامحالہ حاکم اعلیٰ کا خلیفہ (Vicegerent) ہونا چاہیے جو محض تفویض کردہ اختیارات (Delegated powers) استعمال کرنے کا مجاز ہوگا۔

دوسری کانٹے کی بات اس آیت میں یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤں گا، بلکہ یہ کہا کہ ان کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوئی ہے وہ عمومی خلافت (Popular vicegerency) ہے کسی شخص یا خاندان یا نسل یا طبقہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ ہر ہر مومن اپنی جگہ خدا کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً ہر ایک خدا کے سامنے جواب دہ ہے (کلکم راعٍ وکل راعٍ مسئول عن رعیتہ[1]) اور ایک خلیفہ دوسرے خلیفہ کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے فروتر نہیں ہے۔

اسلامی جمہوریت کی حقیقت یہ ہے اسلام میں ڈیموکریسی کی اصلی بنیاد۔ عمومی خلافت کے اس تصور کا تجزیہ کرنے سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں :-

(۱) ایسی سوسائٹی جس میں ہر شخص خلیفہ ہو اور خلافت میں برابر کا شریک ہو، طبقات کی تقسیم اور پیدائشی یا معاشرتی امتیازات کو اپنے اندر راہ نہیں دے سکتی۔ اس میں تمام افراد مساوی الحیثیت اور مساوی المرتبہ ہونگے۔ فضیلت جو کچھ بھی ہوگی شخصی قابلیت اور سیرت کے اعتبار سے ہوگی۔ یہی بات ہے جسکو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار بتصریح بیان فرمایا ہے :

لیس لاحدٍ فضل علی احد الا بدین وتقویٰ الناس کلھم بنو آدم و آدم من تراب	کسی کو کسی پر فضیلت نہیں۔ اگر ہے تو دین کے علم و عمل اور تقویٰ کے اعتبار سے ہے۔ سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

[1] مشہور حدیث ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر راعی خدا کے سامنے اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لابیض علی اسود ولا لاسود علی ابیض الا بالتقویٰ۔	نہ کسی عرب کو عجمی پر فضیلت ہے، نہ عجمی کو عرب پر، نہ گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر۔ فضیلت ہے تو تقویٰ کی بنا پر ہے۔

فتح مکہ کے بعد جب تمام عرب اسلامی اسٹیٹ کے دائرے میں آگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے خاندان، قریش کو، جو عرب میں برہمنوں کی سی حیثیت رکھتے تھے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

یا معشر قریش ان اللہ قد اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیۃ وتعظمھا بالآباء۔ ایھا الناس کلکم من آدم وآدم من تراب۔ لا فخر للانساب۔ لا فخر للعربی علی العجمی ولا للعجمی علی العربی۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔	قریش والو! اللہ نے تمہاری جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا کی بزرگی کے ناز کو دور کر دیا۔ لوگو! تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ نسب کا فخر ہیچ ہے۔ عرب کو عجمی پر اور عجمی کو عرب پر کوئی فخر نہیں۔ تم میں بزرگ وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔

(۲) ایسی سوسائیٹی میں کسی فرد، یا افراد کے کسی گروہ کے لیے اسکی پیدائش یا اس کے معاشرتی مرتبے (Social starus) یا اس کے پیشے کے اعتبار سے اس قسم کی رکاوٹیں (Disbilities) نہیں ہو سکتیں جو اسکی ذاتی قابلیتوں کے نشوونما اور اسکی شخصیت کے ارتقاء میں کسی طرح بھی مانع ہوں۔ اس کو سوسائیٹی کے تمام دوسرے افراد کی طرح ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔ اسکے لیے راستہ کھلا ہوا ہونا چاہیے کہ اپنی قوت واستعداد کے لحاظ سے جہاں تک بڑھ سکتا ہے بڑھتا چلا جائے بغیر اسکے کہ دوسروں کے اسی طور سے بڑھنے میں مانع ہو۔ یہ چیز اسلام میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ غلام اور غلام زادے فوجوں کے

افسر اور صوبوں کے گورنر بنائے گئے اور بڑے بڑے اونچے گھرانوں کے شیوخ نے انکی ماتحتی کی۔ چمار جوتیاں گانٹھتے گانٹھتے اٹھے اور امامت کی مسند پر بیٹھ گئے۔ جولاہے اور بزاز مفتی اور قاضی اور فقیہ بنے اور آج انکے نام اسلام کے بزرگوں کی فہرست میں ہیں۔ حدیث میں ہے کہ اسمعوا واطیعوا ولو استعمل علیکم عبد حبشی۔ سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تمہارا سردار ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ بنا دیا جائے

(۴) ایسی سوسائٹی میں کسی شخص یا کسی گروہ (group) کی ڈکٹیٹرشپ کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ اسلیے کہ یہاں ہر شخص خلیفہ ہے۔ کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں کہ عام مسلمانوں سے انکی خلافت کو سلب کر کے خود حاکم مطلق بن جائے۔ یہاں جو شخص حکمراں بنایا جاتا ہے اسکی اصلی حیثیت یہ ہے کہ تمام مسلمان، یا اصطلاحی الفاظ میں، تمام خلفار اپنی رضامندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لیے اسکی ذات میں مرکوز کر دیتے ہیں۔ وہ ایک طرف خدا کے سامنے جوابدہ ہے اور دوسری طرف اُن عام خلفاء کے سامنے جنہوں نے اپنی خلافت اس کو تفویض کی ہے۔ اب اگر وہ غیر ذمہ دار مطاعِ مطلق، یعنی ڈکٹیٹر بنتا ہے تو خلیفہ کے بجائے غاصب کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ ڈکٹیٹرشپ دراصل عمومی خلافت کی نفی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی اسٹیٹ ایک کلّی اسٹیٹ ہے اور زندگی کے تمام شعبوں پر اس کا دائرہ وسیع ہے، مگر اس کلیت اور ہمہ گیری کی بنیاد یہ ہے کہ خدا کا وہ قانون ہمہ گیر ہے جسے اسلامی حکمراں کو نافذ کرنا ہے۔ خدا نے زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق جو ہدایات دی ہیں وہ یقیناً پوری ہمہ گیری کے ساتھ نافذ کی جائینگی مگر ان ہدایات سے ہٹ کر اسلامی حکمراں خود (Regimentation) کی پالیسی اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ لوگوں کو مجبور نہیں کر سکتا کہ فلاں پیشہ کریں اور فلاں پیشہ نہ کریں۔ فلاں فن سیکھیں اور فلاں نہ سیکھیں۔ اپنے بچوں کو فلاں قسم کی تعلیم دلوائیں اور فلاں قسم کی نہ دلوائیں۔ جو اختیارات

روس اور جرمنی اور اٹلی میں ڈکٹیٹروں نے اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں یا جن کو اتاترک نے ٹرکی میں استعمال کیا، اسلام نے وہ اختیارات امیر کو عطا نہیں کیے - علاوہ بریں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اسلام میں ہر ہر فرد شخصی طور پر خدا کے سامنے جواب دہ ہے - یہ شخصی جوابدہی (Personal responsibility) ایسی ہے جس میں کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ شریک نہیں - لہٰذا اس کو قانون کی حدود کے اندر پوری طرح آزاد ہونا چاہیے کہ اپنے لیے جو راستہ چاہے اختیار کرے، اور جدھر اس کا میلان ہو، اپنی قوتوں کو اسی طرف بڑھنے کے لیے استعمال کرے - اگر امیر اسکی راہ میں رکاوٹ ڈالیگا اور اسکی شخصیت کے نشوونما میں حائل ہوگا تو وہ خود اس ظلم کے لیے اللہ کے ہاں پکڑا جائیگا - یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے خلفاء راشدین کی حکومت میں (Regimentation) کا نام و نشان تک نہیں ملتا -

(۴) ایسی سوسائٹی میں ہر عاقل و بالغ مسلمان کو، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، رائے دہی کا حق حاصل ہونا چاہیے، اس لیے کہ وہ خلافت کا حامل ہے - خدا نے اس خلافت کو کسی خاص معیار لیاقت یا کسی خاص معیار ثروت سے مشروط نہیں کیا ہے بلکہ صرف ایمان و عمل صالح سے مشروط کیا ہے - لہٰذا رائے دہی میں ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ مساوی حیثیت رکھتا ہے -

انفرادیت اور اجتماعیت کا توازن ایک طرف اسلام نے یہ کمال درجہ کی جمہوریت قائم کی ہے دوسری طرف اس نے ایسی انفرادیت (Individualism) کا سدباب کر دیا ہے جو اجتماعیت (Socialism) کی نفی کرتی ہو - یہاں فرد اور جماعت کا تعلق اس طرح قائم کیا گیا ہے کہ نہ فرد کی شخصیت جماعت میں گم ہو جائے، جس طرح کمیونزم اور فاشزم کے نظام اجتماعی میں ہو جاتی ہے، اور نہ فرد اپنی حد سے اتنا بڑھ جائے کہ جماعت کے لیے نقصان دہ ہو،

جیسا کہ مغربی جمہوریتوں کا حال ہے۔ اسلام میں فرد کا مقصد حیات وہی ہے جو جماعت کا مقصد حیات ہے، یعنی قانون الٰہی کا نفاذ اور رضائے الٰہی کا حصول۔ مزید برآں اسلام میں فرد کے حقوق پوری طرح محفوظ کرنے کے بعد اس پر جماعت کے لیے مخصوص فرائض بھی عائد کر دیئے گئے ہیں۔ اس طرح انفرادیت اور اجتماعیت میں ایسی موافقت (Harmony) پیدا ہو گئی ہے کہ فرد کو اپنی قوتوں کے نشو و نما کا پورا موقع بھی ملتا ہے، اور پھر وہ اپنی ان ترقی یافتہ قوتوں کے ساتھ اجتماعی فلاح و بہبود میں مددگار بھی بن جاتا ہے۔ یہ ایک مستقل مبحث ہے جس پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کا یہاں موقع نہیں۔ اس کی طرف اشارہ کرنے سے میرا مقصد صرف ان غلط فہمیوں کا سد باب کرنا تھا جو اسلامی جمہوریت کی مذکورۂ بالا تشریح سے پیدا ہو سکتی تھیں۔

اسلامی اسٹیٹ کی ہیئت ترکیبی خلافت عمومی کے تصور کا جو تجزیہ میں نے کیا ہے اس کو نظر میں رکھنے کے بعد آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی اسٹیٹ میں امام یا امیر یا صدر حکومت کی حیثیت اسکے سوا کچھ نہیں کہ عام مسلمانوں کو جو خلافت حاصل ہے، اُس کے اختیارات وہ اپنے میں سے ایک بہترین شخص کا انتخاب کرکے امانت کے طور پر اسکے سپرد کر دیتے ہیں۔ اُسکے لیے "خلیفہ" کا لفظ جو استعمال کیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس وہی اکیلا خلیفہ ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی خلافت اسکی ذات میں مرتکز (concentrate) ہو گئی ہے۔

اب میں مختصر طور پر اس طرزِ حکومت کی چند خاص خاص تفصیلات بیان کرونگا تاکہ اس کا ایک واضح خاکہ آپ کے سامنے آجائے۔

(۱) امیر کا انتخاب ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم کے اصول پر ہوگا، یعنی عام مسلمان جس کے کیرکٹر پر پوری طرح اعتماد رکھتے ہوں وہی اس منصب کے لیے چنا جائیگا۔ اور جب وہ چن لیا جائیگا تو اس کو سیاہ و سپید کے اختیارات ہونگے۔ اس پر پورا بھروسہ کیا جائیگا جب

تک وہ خدا اور رسول کے قانون کی پیروی کریگا اسکی کامل اطاعت کی جائیگی۔

(۲) امیر تنقید سے بالاتر نہ ہوگا۔ ہر عامی مسلمان اسکے پبلک کاموں ہی پر نہیں بلکہ پرائیوٹ زندگی پر بھی نکتہ چینی کرنے کا مجاز ہوگا۔ وہ قابلِ عزل ہوگا۔ قانون کی نگاہ میں اسکی حیثیت عام شہریوں کے برابر ہوگی۔ اس کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کیا جاسکے گا، اور وہ عدالت میں کسی امتیازی برتاؤ کا مستحق نہ ہوگا۔

(۳) امیر کو مشورے کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ مجلس شوریٰ ایسی ہوگی جسے عام مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہو۔ اس امر میں بھی کوئی شرعی مانع نہیں ہے کہ اس مجلس کو مسلمانوں کے ووٹوں سے منتخب کیا جائے، اگرچہ اسکی مثال خلافت راشدہ میں نہیں ملتی۔

(۴) عموماً مجلس کے فیصلے کثرت رائے سے ہونگے۔ مگر اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ قل لا یستوی الخبیث والطیب ولو اعجبك كثرة الخبيث۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کی رائے کے مقابلہ میں برحق ہو۔ اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اسلیے چھوڑ دیا جائے کہ اسکی طرف قلت ہے اور باطل کو اس لیے اختیار کیا جائے کہ ایک جم غفیر اس کی تائید میں ہے۔ لہٰذا امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ۔ اور امیر کو یہ بھی حق ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کرکے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔ مگر ہر صورت میں عامۂ مسلمین اس بات پر نظر رکھینگے کہ امیر اپنے ان وسیع اختیارات کو تقویٰ اور خوفِ خدا کے ساتھ استعمال کرتا ہے، یا نفسانیت کے ساتھ۔ بصورت دیگر رائے عام اس امیر کو مسند امارت سے نیچے بھی اتار سکتی ہے۔

(۵) امارت، یا مجلس شوریٰ کی رکنیت یا کسی ذمہ داری کے منصب کے لیے کوئی ایسا شخص منتخب نہ کیا جائیگا جو خود اس کا امیدوار ہو، یا کسی طور پر اس کے لیے کوشش کرے۔ اسلام میں

امیدواری (Candidature) اور انتخابی پروپیگنڈا کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاف ہدایت ہے کہ امیدوار کو کوئی منصب نہ دیا جائے۔ اسلامی ذہنیت اس بات کے خیال تک سے نفرت کرتی ہے کہ ایک منصب کے لیے دو، تین، چار امیدوار کھڑے ہوں، ایک دوسرے کے خلاف پوسٹر بازی، جلسہ بازی اور اخباری پروپیگنڈا کریں، ووٹروں کو طرح طرح سے بیوقوف بنائیں، کھانوں کی دیگیں چڑھائی جائیں، موٹریں دوڑیں، اور ان میں سے وہ امیدوار بازی لے جائے جو جھوٹ، فریب، اور زرپاشی میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔ یہ شیطانی ڈیموکریسی کے ملعون طریقے ہیں جن کا عشر عشیر بھی اسلامی حکومت میں برسرکار آئے تو خلافت کی مجلس شوریٰ میں منتخب ہو کر جانا تو در کنار، ایسے لوگوں کو قاضی کی عدالت میں پیش کر کے سزا دلوا دی جائے۔

(۶) اسلامی مجلس شوریٰ میں پارٹی بندی نہیں ہو سکتی۔ فرد فرد علیٰحدہ ہوگا اور حق کے مطابق رائے دیگا۔ اسلام میں اس کا موقع نہیں کہ آپ ہر حال میں اپنی پارٹی کے ساتھ رہیں خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر۔ بلکہ اسلامی اسپرٹ کا تقاضا یہ ہے کہ آج کسی کی رائے کو آپ حق پر پائیں تو اس کا ساتھ دیں، اور کل کسی دوسرے مسئلے میں اگر اسی شخص کی رائے آپ کے نزدیک خلافِ حق ہو تو اس سے اختلاف کر دیں۔

(۷) اسلام میں عدالت کے شعبہ کو انتظامی شعبہ کے اثر سے کلیۃً آزاد رکھا گیا ہے۔ قاضی کا کام خدا کے قانون کو اس کے بندوں پر نافذ کرنا ہے۔ وہ عدالت کی کرسی پر امیر یا خلیفہ کے نائب کی حیثیت سے نہیں بلکہ اللہ عزوجل کے نائب کی حیثیت سے بیٹھتا ہے۔ لہٰذا عدالت میں اسکے سامنے خود خلیفہ کی بھی کوئی وقعت نہیں۔ کسی کو اپنی شخصیت یا اپنے خاندان یا اپنے عہدے کی وجہ سے یہ حق حاصل نہیں کہ قاضی کے سامنے حاضر ہونے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ ایک ادنیٰ

مزدور، ایک غریب کاشتکار، ایک فقیر بے نوا بھی اس کا حق رکھتا ہے کہ بڑے سے بڑے شخص، حتیٰ کہ خود خلیفہ کے خلاف قاضی کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دے۔ اور قاضی کو پورے اختیارات حاصل ہیں کہ اگر مدعی کا حق ثابت ہو جائے تو خدا کا قانون خلیفہ پر بھی ٹھیک اُسی طرح نافذ کر دے جس طرح ایک عامی مسلمان پر کرتا ہے۔ اسی طرح اگر خود خلیفہ کو اپنی ذاتی حیثیت میں کسی کے خلاف شکایت ہو تو وہ اپنے حاکمانہ اختیارات استعمال کر کے خود اس شکایت کو رفع کرنے کا حق نہیں رکھتا، بلکہ از روئے آئین وہ مجبور ہے کہ ایک عام شہری کی طرح عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے۔

اس مختصر خطبہ میں میرے لیے موقع نہیں کہ اسلامی اسٹیٹ کی تفصیلی صورت آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔ اس کی اسپرٹ اور اس کے طرزِ کارروائی کو پوری طرح سمجھنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے دورِ حکومت کی نظیریں پیش کرنا ضروری ہے اور اس کی گنجائش یہاں نہیں ہے۔ تاہم مجھے توقع ہے کہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے وہ اسلامی طرزِ حکومت کا ایک واضح تصور پیش کرنے کے لیے کافی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین